جدید عربی نثر نگاری کے ارتقائی مراحل

ڈاکٹر محمد راشد ندوی

(۳)

لطفی السید:

۱۸۸۲ء میں محمد علی کے خاندان کے خلاف عُرابی پاشا کی قیادت میں جو عظیم الشان انقلاب برپا ہوا اس سے مصری عوام کی بہادری اور ان کی قومی غیرت و محبت کا اندازہ ہوتا لیکن انقلاب کی ناکامی کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی وہ بڑی افسوس ناک ہے، بلکہ بڑی حد تک عبرت ناک ہے۔ وہ یہ کہ جن سیاسی لیڈروں نے عوام کے اندر جوش و خروش، ہمت و حوصلہ پیدا کیا تھا وہ خود مایوسی کے اس طرح شکار ہوئے کہ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ مصر کا حاکم بھی اپنے کو بے بس اور بے سہارا پا رہا تھا۔ انگریزوں نے بڑی مہارت سے اپنا تسلط مصر کے چپہ چپہ پر قائم کر لیا تھا مصری عوام جو کل تک جوش و خروش کے عالم میں اپنے خون کا آخری قطرہ وطن عزیز کی راہ میں بہانے کے لیے تیار تھے اب وہ کبھی بے بسی کے عالم میں اپنے حاکم خدیو عباس کو دیکھتے اور کبھی وہ انگریزوں کے ظلم و استبداد پر نظر ڈالتے اور کبھی ان کے مکر و فریب کی داستانیں سنتے۔ سیاسی رہنما یا تو شہر بدر یا ملک بدر تھے یا ملک کے اندر اسیر تھے اور جو آزاد بھی تھے ان کی زبانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ کوئی سیاسی جماعت وجود میں آئے تو اس کے فکر کا محور کیا ہو۔ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کرے یا خدیو عباس کے خلاف پھر لوگوں کو بھڑکائے جو خود بے بس اور بے سہارا تھے۔ یا انگریزوں اور خدیو سے [illegible]

کے خلاف تحریک چلائے۔ گویا ان حالات میں جو سیاسی پیچیدگیاں تھیں اس کا اندازہ صحیح معنوں میں وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس وقت مصر میں موجود تھے۔ ہم اتنا تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مصر کی سیاسی زندگی سمندر کے بھنور کی طرح تھی جس میں عوام کی کشتی پھنسی ہوئی تھی اور اس کے ملاح کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوگئے تھے۔ یا صحرا کے بگولے جس میں کاروان اور میر کارواں دونوں یکساں خائف اور پریشان نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں ایسی سیاست اور تدبّر کی ضرورت تھی جس سے عوام کے دلوں کی مایوسی اور ان کے خوف و ہراس کو نکالا جا سکے۔ قدرت نے اس وقت مصر کے چند ایسے نوجوانوں کو سیاست کے میدان میں لاکر کھڑا کر دیا جن کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کبھی بھی عوامی تحریک میں آئیں گے۔ وہ وہ نوجوان ہیں جو مصر کے خوش حال بلکہ وہاں کے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کے بچے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر کی تعلیم و تربیت یوروپ میں ہوئی تھی جو مغرب کے فکر و فن اور ان کے مکر و فریب دونوں سے واقف تھے۔ اب وہ عوام کی صحیح راہنمائی کرنا چاہتے تھے اس رہنمائی میں جذبات کے بجائے فکر اور شاعرانہ تخیلات کے بجائے حقائق بینی تھی۔ انھیں نوجوانوں میں لطفی السید ہیں۔ جو ۱۸۸۲ء میں مصر کے مشہور مردم خیز ضلع دتھلیہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اس ضلع کے خوشحال خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور خدیو کی طرف سے ان کے والد کو پاشا کا لقب بھی ملا تھا۔ شروع میں انھوں نے کلام پاک کو حفظ کیا اس کے بعد ابتدائی اور ثانوی مرحلے کی تکمیل کی۔ ثانوی مرحلہ میں ہی انھیں عربی زبان و ادب، تاریخ و اجتماعیات سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ثانوی مرحلہ کے بعد وہ قانون کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ عام طور سے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کے لڑکے قانون ہی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ فیکلٹی آف لاء میں انھیں ایک کامیاب استاد مل گئے جو جدید قانون کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور انھیں لطفی السید سے خاص لگاؤ پیدا ہوا اور انھوں نے لطفی السید کو جدید قانون کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون کے مطالعہ کی بھی تلقین کی۔ اس طرح مغربی قانون کی روشنی میں جب انھوں نے اسلامی قانون کا مطالعہ کیا تو انھیں اسلام کی آفاقیت کا ادر

شریعت اسلامیہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ قانون کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ حکومت کے مختلف محکموں میں کام کرتے رہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن ان اداروں اور عہدوں کو قبول نہیں کرتا تھا جس میں پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اس طرح انھوں نے حکومت کے عہدوں سے سبکدوش ہو کر سیاسی میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنا شروع کیا کہ ملک کو دشمن کے چنگل سے کس طرح نکالا جائے۔ ان نوجوانوں کے فیصلے اور ان کے ارادہ کی خبر خدیو عباس تک پہنچی تو اس نے بھی ان لوگوں کے ارادے کا خیر مقدم کیا کیونکہ وہ خود اپنے کو اسیر اور بے بس محسوس کر رہا تھا اور اس کی بھی دلی تمنا تھی کہ انگریز جلد از جلد مصر کو آزاد کر کے یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ لطفی السید اپنی اس مہم کو لے کر سوئٹزرلینڈ گئے ۔ ۔ ۔ دوسرے انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلا سکیں اور یورپ کے ممالک کی تائید حاصل کر سکیں۔ بس واقعہ کی کہانی ان کی زبانی سنیے:

”خدیو عباس کے کہنے پر میں سوئٹزرلینڈ گیا، وہاں پہنچ کر میرا ارادہ تھا کہ مصر شہریت ۔ دست بردار ہو جاؤں اور وہیں کی شہر ۔ ۔ ۔ حاصل کر لوں تاکہ وہی اخبار ۔ سے مصر کا مسئلہ یورپین مفکرین کے سامنے رکھ سکوں۔ اس طرح میں نے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے پوری کوشش کی۔ وہاں پہونچ کر میں نے علماء، سیاسی رہنما سے مصر کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا اس سلسلہ میں میری گفتگو جو سوئزرلینڈ کے مشہور عالم آثار قدیمہ جناب نو ۔ ۔ ۔ سے ہوئی وہ قابل ذکر ہے جناب یوں نے مجھ سے صاف صاف کہا: ہو سکتا ہے یورپ کی ہمدردی آپ لوگوں کو حاصل ہو جائے لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یورپین مزاج یہ ہے کہ وہ بغیر اپنے ذاتی مفاد کے کسی کی بھی مدد نہیں کرتے۔ اس لیے مصریوں کو اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دینا چاہیے کہ یورپ کا کوئی ملک بھی انگریزوں کے خلاف ان کی مدد کرے گا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ مصر کے لوگ اپنے بہادر ۔ ۔ ۔ دی کی تحریک چلا ۔ ۔ ۔ یہ طریقہ ان کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد ان کی ملاقات شیخ محمد عبدہ سے جنیوا میں ہوئی۔ وہ عرابی تحریک میں شامل تھے اور دوسری طرف انگریز یہ بھی

معلوم تھا کہ اگر وقت خدیو عباس نے انگریزوں کے خلاف جو تحریک چلائی ہے جس میں کیا راز مضمر ہے عبدہ نے لطفی السید کے سامنے ملک کی سیاسی و سماجی خدمت کرنے کے لیے دوسرا طریقہ پیش کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ مصر میں اس وقت سیاسی اور فکری بیداری پیدا کی جائے اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جب ملک کے نظام تعلیم کا ڈھانچہ بدلے اور لوگوں میں نئے علوم و فنون کی روشنی پھیلے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ جتنا مفید تھا اتنا ہی صبر آزما کیونکہ اس کے لیے کافی وقت درکار تھا اور دوسرے تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سماج کی پرانی شکل بدلے گی اور نئے نئے نظریات منظر عام پر آئیں گے اس طرح عوام ایک اندرونی کشمکش کا شکار ہو جائیں گے۔ اور تحریک آزادی مدھم پڑ جائے گی۔ بہر صورت جناب میول اور شیخ محمد عبدہ کی باتیں لطفی السید کے ذہن نشین ہوگئیں وہ یہ کہ مصر کی آزادی مصریوں کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک عوام میں سیاسی اور سماجی شعور اچھی طرح بیدار نہ ہو جائے۔ اس طرح انھوں نے عبدہ کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنے عمل کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا اور مصر واپس ہوئے۔

لطفی السید کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم اگرچہ مصر میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے محنت اور لگن سے مغربی علوم اور خاص طور سے تاریخ، فلسفہ، علم اجتماعیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے ذریعہ سے مغرب کے علمی اور فکری، ارتقائی مراحل سے بھی ان کو واقفیت حاصل ہوگئی تھی اور دوسرے مغربی ملکوں کے دورے اور وہاں کے علماء و ادباء سے تبادلہ خیال کے ذریعہ ان کے ذہن کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں اسی لیے جب وہ مصر واپس ہوئے تو عوام کی خدمت کرنے کا ان کے ذہن میں ایک مفصل نقشہ تھا اور اپنی خاندانی خوش حالی کی دولت وہ بے فکر ہو کر اطمینان کے ساتھ عوام کی خدمت کر سکتے تھے۔ چنانچہ سنہ۱۹۰۷ء میں مصر میں ایک نئی سیاسی پارٹی حزب الامتہ کے نام سے وجود میں آئی اور اس پارٹی کا ایک ترجمان جو الجریدۃ کے نام سے نکلنا طے پایا۔ پارٹی کے ممبران نے متفقہ طور پر لطفی السید کو اس کا مدیر متعین کیا۔ یہ رسالہ سنہ۱۹۰۷ء سے لے کر سنہ۱۹۱۲ء تک بڑی پابندی سے [illegible] اور اس جریدہ میں عربوں نے ایسے ایسے مضامین اور مقالات پڑھے جو عام طور سے اس [illegible] عربی [illegible]

د مجلات میں نہیں پائے جاتے تھے۔ الجریدہ میں لکھنے والے زیادہ تر وہی نوجوان تھے جو
مغربی ثقافت و تہذیب کے اصول و ضوابط سے واقف تھے تو دوسری طرف ان کی گرفت
عربی زبان و ادب پر بڑی مضبوط تھی۔ اور اس الجریدہ میں لطفی السید نے اداریہ کے علاوہ مختلف
موضوعات پر مقالات و مضامین لکھے جن سے ان کے تنوع فکر اور زور قلم کا اندازہ کیا جا سکتا
ہے۔ یہ جریدہ اگرچہ ایک سیاسی پارٹی کا آرگنائزر تھا لیکن درحقیقت یہ عرب نوجوانوں کی فکری
اور علمی تربیت کر رہا تھا جو ایک بڑی علمی اکیڈمی کی حیثیت سے مؤثر اور اثر انداز تھا۔ اور لطفی السید
اس جریدہ کے مدیر ہی نہیں تھے بلکہ ایک معلم کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے۔

۱۹۱۴ء میں یہ رسالہ بعض سیاسی اسباب سے تحت بند کر دیا گیا لیکن نوجوان اس رسالہ میں
لکھتے تھے اور خاص طور سے اس کے مدیر جناب لطفی السید جن کے اداریے اور سیاسی، علمی، ادبی،
مضامین کی دھوم مصر کے ہر حلقہ میں تھی وہ رسالہ کے بند ہونے کے بعد بھی خاموش نہیں بیٹھے کیونکہ ان کی
منزل تو پارٹی بازی نہیں تھی بلکہ ان کی منزل عوام کو نئی فکر، نئے خیالات، نئے علوم" بس اور نفیس
زبان کے ذریعہ سے روشناس کرانا تھا۔ لطفی السید مختلف سیاسی پارٹیوں میں شریک ضرور تھے لیکن
سیاسی ہنگاموں سے ہمیشہ بچتے اور کتراتے رہے۔ عوامی نعروں کو مفید نہیں بلکہ مہلک سمجھتے تھے۔
وہ سیاست داں تو ضرور تھے لیکن وہ درحقیقت ایک مدبر اور مفکر تھے۔ خدا نے ان کو طویل عمر عطا
کی تھی اور اس طویل عمر میں عوام کی سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور ادبی رہنمائی بھی کرتے
تھے۔ وہ دارالکتب المصریہ کے مدیر بھی مقرر کیے گئے جہاں خاموشی سے لکھنے پڑھنے کے مواقع
نصیب تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے ارسطو کا عربی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اپنی نوعیت
کا عربی زبان میں پہلا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد وہ قاہرہ یونیورسٹی کے جو اس زمانہ میں جامعہ فواد کے
نام سے مشہور تھی اس کے انس چانسلر مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی میں رہ کر انھیں اساتذہ اور طلباء
سے علمی اور ادبی رابطہ قائم کرنے کے مواقع میسر ہوئے۔ انھوں نے اپنے زمانہ میں یونیورسٹی کے
وقار کو کافی بلند کیا اور اساتذہ نے اندر علم دوستی اور علم نوازی کی روح پیدا کی۔ چنانچہ مصر کے

ہر حلقہ کے لوگوں نے انھیں "استاذ الجیل" (نئی نسل نے معلم اور استاذ) کا لقب دیا۔ لطفی امید کو خدا نے جتنی صلاحیت عطا کی تھی اس اعتبار سے ان کا علمی اور ادبی سرمایہ کم نظر آتا ہے لیکن جتنا موجود ہے اس میں فکر و خیال کے تنوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا ایسا طریقہ پایا جاتا ہے جو ہمیشہ کے لیے عربی نثر کا اعلیٰ نمونہ تصور کیا جاتا رہے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی طریقۂ تعبیر و اظہار آج تک مقبول رہا ہے۔ جس کو ان کے ساتھیوں اور شاگردوں نے جاری و برقرار رکھا۔ اس کے بعد ہم شام کے ادیب و مفکر کرد علی کے طریقہ تعبیر و بیان پر بحث کریں گے۔ جنھیں شیخ عبدہ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی۔ جو درحقیقت ملک شام میں عبدہ فکر کی کڑی ہیں۔

کرد علی: کرد علی ۱۸۷۶ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے اپنی ذاتی محنت اور مشقت سے دمشق کے مضافات میں باغات لگوا دیے تھے جن کی بدولت ان کا خاندان بڑی حد تک خوش حال تھا۔ ان کے دادا دمشق کے مشہور تاجروں میں تھے لیکن دولت عثمانیہ کے بعض حکام کے ظلم کا شکار ہوئے اور ان کا دیوالیہ ہوگیا۔ ان کے دادا نے اس افسر کی شکایت سلطان عبدالحمید سے کی اور سلطان نے ان کے دادا کو بلایا وہ استنبول گئے۔ ان کے دادا اور سلطان عبدالحمید کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس کو کرد علی نے اپنی ذاتی سوانح حیات میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کا کچھ اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

"جب خلیفہ نے میرے دادا سے کہا کہ تمہارے مال کے عوض میں دمشق کے مضافات "غوطہ" میں دو گاؤں لکھ دیے جائیں گے۔ اس پر دادا نے بڑے مؤدبانہ انداز میں خلیفہ سے یہ کہا کہ "حضور! میں آپ کے دربار میں صدقہ یا خیرات کا طالب ہو کر نہیں آیا ہوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ حضور ایک ظالم کو اس کے ظلم پر متنبہ کریں۔ یہاں عدل و انصاف کا طالب ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مجھے آپ کے گاؤں کی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر وہ خلیفہ نے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر اپنے وطن دمشق واپس چلے آئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔"

کرد علی نے اپنے دادا کی گفتگو کے اس سلسلہ کو تاریخ میں کردار و عزیمت کا اعلیٰ نمونہ تصور کیا ہے۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو یہ اعلیٰ قدریں کرد علی کی زندگی کے ہر لمحہ میں پائی جاتی رہیں۔ اور وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں کسی بڑے سے بڑے ظالم کے سامنے جھکے نہیں۔ بلکہ عزم و استقامت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کرد علی کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم دمشق میں ہوئی۔ اور ثانوی تعلیم کے بعد شام کے علاقہ میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ ہونہار اور خوشحال نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس جایا کرتے تھے لیکن کرد علی کو باہر جانے کا موقع نہیں ملا اور انھوں نے ثانوی تعلیم پر اکتفا کی اور خود سے ہر موضوع کی کتابیں بڑے شوق و لگن سے پڑھتے اور یونیورسٹی اور جامعات کی اعلیٰ تعلیم کی اس کمی کو خود سے انھوں نے پورا کیا۔ ان کے مزاج میں بڑی شوخی اور رنگینی تھی جس کی بدولت ان کا ادبی ذوق بھی بڑا شگفتہ تھا۔ وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:-

"شاعری اور موسیقی سے مجھے بڑی الفت اور دلچسپی تھی، جوانی میں میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن میرے استاذ اور مربی طاہر الجزائری نے مجھے شعر و شاعری سے روکا اور یہ نصیحت فرمائی کہ میں تحریر و انشاء میں اچھا ملکہ حاصل کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے استاذ کی بات مان لی۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے مجھے اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ تنہائی میں اچھے اشعار کو ترنم اور نغمے سے پڑھا کرتا تھا اور مجھے اس میں بڑا کیف اور لطف حاصل ہوتا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو میں فن موسیقی میں بڑی مہارت حاصل کرتا اور زندگی کے کٹھن اور دشوار گھڑیوں میں مجھے اس سے بڑی مدد ملتی لیکن میرے والد نے مجھے فن موسیقی سے روکا کیونکہ موسیقی اس وقت شریف خاندانوں کے لڑکوں کے لیے اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے اپنے والد کی بات کو ہر حال میں ماننا تھا۔ اس طرح میں شعر و شاعری اور موسیقی کی لذتوں سے محروم ہو گیا"

کرد علی کو شاعری اور موسیقی کے فن میں مہارت نہیں حاصل ہو سکی لیکن جہاں تک موسیقی کی روح و اثر کا تعلق ہے وہ ان کے مزاج و طبیعت کا جزو بنی رہی جس کے اثرات ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔ صحافتی زندگی میں انھیں ناکارہ حکام، سماج کی برائیوں، روایتی قدروں پر نقد و تبصرہ چھیڑ چھاڑ سے بڑا مزہ ملتا تھا۔ دوسرے واقعات و مناظر کی تعبیر و توصیف میں ان کے قلم کو غیر معمولی

قدرت حاصل تھی۔ اپنی قوم کی تباہی اور پستی کا جہاں وہ ذکر کرتے ہیں ان کی تحریریں ربط و تسلسل روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز کا عجیب و غریب مرقع بن جاتی ہیں اور پڑھنے والے کو ان میں شاعری کا دل اور فنکار کا قلم نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ بحیثیت مؤرخ، ادیب، صحافی بہت کامیاب رہے ہیں۔ کرد علی کو دولت عثمانیہ اور اس کے محروسہ علاقوں کے عوام سے غیر معمولی لگاؤ اور تعلق تھا اس لیے ان کے مسائل کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے تھے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں بھی علمی انداز پایا جاتا ہے۔ سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ انھیں سیاسی اور مذہبی مسائل سے بھی لگاؤ تھا۔ اور انھوں نے اسی دور کے مفکرین کے فکری اور علمی رجحانات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس دور کے مفکرین میں وہ شام کے مشہور عالم شیخ طاہر الجزائری اور مصر کے مصلح اور رہنما شیخ محمد عبدہ اور وہاں کے مایۂ ناز ادیب اور محقق احمد تیمور سے بہت متاثر تھے۔ انغانی اور عبدہ کے سیاسی اور مذہبی نظریات مصر ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام میں پھیل چکے تھے لیکن دونوں کی اصلاحی تحریکیں مصر ہی سے رونما ہوئی تھیں اس لیے اس کے اثرات مصر میں زیادہ تھے۔ کرد علی مصر کی عظمت اور وہاں کے علماء کی علمی کاوشوں سے بہت متاثر تھے۔ پہلی بار وہ مصر ۱۹۰۱ء میں گئے تھے اور دوسری بار ۱۹۰۵ء میں۔ پہلے سفر کا مقصد صرف سیاحت تھا اور دوسری بار وہ ترکی حکام کی زیادتیوں سے تنگ آکر گئے تھے اور تقریباً تین سال وہاں مقیم رہے۔ حقیقت میں یہی زمانہ ان کی فکری اور علمی نشو و نما کا تھا۔ شام میں انھوں نے کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ مگر علمی میدان میں وہ اپنے کو تنہا اور کمزور محسوس کر رہے تھے لیکن مصر جاکر ان کے خیال میں آفاقیت اور عزم و ارادہ میں استحکام پیدا ہوا۔ وہاں کے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ادیبوں اور سیاست دانوں سے تعارف ہوا اور ان کے علمی و فکری رجحانات سے انھوں نے استفادہ کیا۔ مصر کے عوام کے مزاج و کردار سے بہت متاثر تھے وہ اس رجحان اور تصور کی ترجمانی کر رہے تھے جو خود کرد علی کے ضمیر کی آواز تھی۔ پروفیسر شفیق الجبیری کے بقول:

"کرد علی نے مصر میں ایک دنیا دیکھی وہاں برطانوی استعمار کے باوجود لوگوں کو اپنے افکار و نظریات کے اظہار کی پوری آزادی تھی۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے ذوق　　کا ان پر بڑا اثر پڑا۔"

حقیقت میں وہ مصر کے جن ادیبوں اور مفکرین سے متاثر ہوئے ان میں شیخ محمد عبدہ اور احمد تیمور ہیں۔ شیخ محمد عبدہ کی وسعت فکر اور تجدد پسندی اور تیمور کی عربی ثقافت و ادب میں گہری بصیرت سے وہ بے حد متاثر تھے۔ احمد تیمور کی شخصیت عربی زبان و ادب کی زندہ تصویر تھی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"۱۹۰۱ء میں جب میں مصر گیا تو میرے ایک دوست نے (شاید وہ علامہ رشید رضا تھے) مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی میں احمد تیمور سے شرف ملاقات حاصل کروں۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آج ان کی قیام گاہ پر مصر کی ممتاز شخصیتیں جمع ہونے والی ہیں۔ جن میں شیخ محمد عبدہ اور ان کے بہت سے رفقاء بھی ہیں میں نے ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ہمراہ جانے کی خواہش کی۔ میں ان کی رفاقت میں وہاں گیا۔ احمد تیمور کا گھر قدیم طرز کا عظیم الشان محل تھا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ مصر کے بہت سے ادباء و شعراء و سیاستدانوں کا اجتماع اس محل کے لیے باعث زینت بنا ہوا ہے۔ جس میں سعد زغلول، قاسم امین، احمد اسکندر، حافظ محمد ابراہیم، قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ محمد عبدہ کے رفیق کار اور تیمور کے دوست ہیں۔ اسی موقع پر مجھے مصر کی عظمت کا جلوہ نظر آیا اور صاحب محل کا ایک اجنبی شخص کے لیے غیر معمولی خیر مقدم اور محبت نے اس کے دل و دماغ کو موہ لیا اور اسی لمحہ میں ان کے حلقہ کا ایک فرد ہو گیا۔"

احمد تیمور عرب قوم، عربی زبان و ادب اور اسلام سے غیر معمولی محبت و عقیدت رکھتے تھے اور تینوں کو ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تصور کرتے تھے اس لیے ان میں سے کسی ایک کی تنقیص یا تحقیر نہیں کرتے تھے۔ تیمور کے اثرات کرد علی پر غیر معمولی طور پر پڑے۔ چنانچہ انھوں نے جب　　کو ترک کر کے تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا تھا ان کے ذہن میں　　صحیح

تاریخ اور عربی ثقافت کی حقیقی تصویر پیش کرنے کا حقیقی تصور پیدا ہوا۔ جہاں تک اسلامی فکر میں تجدد اور عربی سماج و سوسائٹی میں اصلاح کا تعلق ہے وہ عبدہ سے متفق تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے ترقی پسند نظریات اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتے۔ جب تک کہ لوگ عربی ثقافت و تہذیب کے اس خزانہ سے واقف نہ ہو جائیں جو صدیوں میں بکھرا ہوا ہے۔ جس میں انسانی فکر و خیال کی عظمت بلوہ گر ہے۔ اس طرح وہ عبدہ کے تصورات کے فروغ کے لیے تیمور کے طریقۂ عمل کو زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شام میں اسی طریقہ سے کام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابو حنیفہ، شافعی، مالک، ابن حنبل، ابن تیمیہ، ابن حزم، غزالی، رازی اور معتزلہ، خوارج و شیعہ کے ائمہ و مجتہدین کی تخلیقات کو اگر اسلامی ثقافت و فکر کے روشن باب کی حیثیت سے دیکھا جائے تو جمود اور تقلید کی تمام زنجیریں خود بخود ٹوٹ جائیں گی اور موجودہ سماج کے امراض و علل کی دوا بھی انھیں لوگوں کے یہاں آسانی سے دستیاب ہو جائے گی۔ ائمہ و مجتہدین میں تفریق کی وجہ سے ہمارے فکر و خیال پر جمود کی تہیں پڑ گئی ہیں اور ہم اپنے امراض کا مداوا انھوں کے یہاں نہیں بلکہ غیروں کے یہاں تلاش کرتے ہیں۔ کرد علی نے اسی عقیدہ و تصور کی روشنی میں تالیف و تصنیف کا آغاز کیا کرد علی نے شیخ طاہر الجزائری، شیخ محمد عبدہ اور احمد تیمور کے طریقۂ فکر و طریقۂ کار میں ہم آہنگی پیدا کر کے شام کے علاقہ میں اس کی اشاعت و تبلیغ شروع کر دی۔ اور یہ تبلیغ و اشاعت سرسری اور سطحی مضامین کے ذریعہ سے نہیں بلکہ وقیع علمی مقالات اور جاندار انیف کے ذریعہ سے کی۔ وہ عوام کے اجتماعات اور ہنگاموں سے دور رہ کر اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل کتب خانوں میں پاتے تھے اور جو لمحات ان کے ان میں گذرتے ان کو اپنی زندگی کے حسین لمحات میں تصور کرتے۔ ان کے ذہن میں اسلامی فکر و ثقافت کا وسیع تصور تھا جو مختلف موضوعات میں بٹے ہوئے تھے۔ اسی لیے اسلامی فکر و ثقافت کی گہرائی و گیرائی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اسلامی تاریخ جو مختلف ادوار میں جو علمی اور ادبی مذہبی اور سیاسی کارنامے وجود میں آئے ہیں ان کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے اور اس مطالعہ کے بعد

جو جدید دور میں ادب وثقافت کے جو مختلف دھارے جو دنیا میں بہہ رہے ہیں ان سے کچھ آشنائی نہ حاصل کی جائے۔ چنانچہ عربی ثقافت اور تہذیب کو انھوں نے عرب ممالک کے کتب خانوں میں دیکھا اور مغربی تہذیب و ثقافت کو انھوں نے کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ عینی مشاہدہ سے دیکھنا چاہا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"میں نے چار بار یورپ کا سفر کیا یعنی ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۸ء میں۔ میرے سفر کا مقصد تفریح کے علاوہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کا مطالعہ اس کے اصل مرکز میں کروں۔ جہاں تک مطالعہ کا تعلق ہے میں ہر ملک کے بارے میں پہلے ہی کچھ جانتا تھا لیکن عینی مشاہدہ کے فوائد سے محروم تھا۔ مجھے شوق تھا کہ میں اپنی معلومات کی روشنی میں مشاہدہ کی مدد سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکوں۔ میں نے ہر ملک کے سیاسی اور سماجی ڈھانچہ کا عمیق مطالعہ کیا اور ہر ملک کے بارے میں رائے قائم کی۔ بعض ملکوں میں کسی کے توسط کے بغیر لوگوں سے ملتا تھا اور وہاں کے حالات پر تبادلہ خیال کرتا تھا۔ بعض ملکوں میں مجھے مترجم (Interpreter) کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہاں مجھے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ یورپ کے ہر علاقہ میں مجھے نئے نئے انکشافات ہوئے لیکن جہاں تک یورپ کی مجموعی تمدن کا تعلق ہے مجھے سوئٹزرلینڈ میں یورپین تہذیب کی رنگا رنگی نظر آئی۔ یورپ کی تہذیب کو میں ایک سفر میں نہیں بلکہ کئی سفروں کے بعد سمجھ سکا۔"

یورپ میں کردعلی کو جس چیز نے سب سے زیادہ مرعوب و متاثر کیا وہ تھی وہاں کے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی آزادی۔ ان کا خیال تھا آزادی ہی ایسی نعمت ہے کہ جسکی بدولت انسانی فکر و خیال کو ابھار، ہمت و حوصلہ کی توانائی اور استحکام، نظام و انتظام کو استواری نصیب ہو سکتی ہے۔ تمدن کے جتنے مظاہر ہیں سب کی آبیاری، آزادیٔ خیال اور آزادیٔ فکر سے ہوتی ہے۔ اس کے چلتے پارلیمانی نظام، سنجیدہ اور ترقی پسند ادب، سائنس کی غیر محدود ترقی میں نظر آتے ہیں۔ آزادی کے صحیح مفہوم و تصور کو انھوں یورپ کے ہر گوشہ میں دیکھا اس لئے

جب وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں تو آزادی کی طلب، ان کی تحریر وں میں بحر موا ی کی طرح امڈتی نظر آتی ہے۔

کرد علی نے اپنے یوروپ کے تاثرات و مشاہدات کو کتابی شکل میں قلمبند کیے ہیں۔ جو غرائب الغرب کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اور یہ مشاہدات و تاثرات ادب عالیہ کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ کرد علی کو طویل عمر نصیب ہوئی۔ وہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح ان کو تقریباً ۷۷ سال کی عمر نصیب ہوئی اور جب سے انھوں نے قلم اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ جب وہ صحافت کے میدان میں تھے تو وہ ایک کامیاب صحافی کی حیثیت سے روشناس ہوئے اور جب انھوں نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا تو ان کے قلم سے جو تحقیقی اور تصنیفی عمل وجود میں آئے وہ دنیائے عرب کے لیے نادر تحفہ ہیں۔ انھوں نے تاریخ، تحقیق ادب، تنقید پر دقیع اور قیمتی کتابیں لکھیں اور ان کے علاوہ ادبی اور سیاسی اور سماجی مسائل پر انھوں نے حیرت انگیز مقالات و مضامین لکھے جو امراء البیان، کنوز الاجداد، القدیم والحدیث، اقوالنا وافعالنا کے نام سے مستقل کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اور یہ کتابیں اپنی زبان و بیان۔ ریسرچ و تحقیق کے اعتبار سے اعلا تو ہیں ہی اور ان میں کرد علی کا مجا ہوا قلم اور ان کی شوخی طبع بہ سطرح برکا گر ہے۔ ان تمام ادبی اور علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ کرد علی نے ایک تحقیقی ادارہ جو المجمع العلمی، کے نام سے مشہور ہے، قائم کیا۔ جو دنیائے عرب کا سب سے پہلا علمی اور ادبی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ شام ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے عرب کے لیے نمونہ بنا اور اس کے طرز کے بعد میں دوسرے علمی ادارے دوسرے عرب ملکوں میں قائم کیے گئے۔ اس ادارہ کی بنیاد ۱۹۱۸ء میں رکھی گئی تھی۔ کرد علی اس ادارہ میں تقریباً پچاس سال تک خدمت انجام دیتے رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اسلامی علوم و فنون کا کتنا مرتب خاکہ موجود تھا۔ پھر انھوں نے المجمع العلمی کی تعمیر و ترقی کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جس سے ان کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی ادارہ کے تحت ایک علمی

رسالہ کا اجرا کیا جو مجلۃ المجمع العلمی کے نام سے مشہور ہے۔ پچاس سال کی تاریخ میں جو مضامین و مقالات اس میں شائع ہوئے اس کے علمی وقار کی زندہ مثال ہیں۔ کرد علی کی گوناگوں شخصیت نے عرب ملکوں کے ادیبوں اور محققوں کو مجلہ سے وابستہ کر دیا جس کی وجہ سے اس کے مضامین و مقالات میں ایسی ہمہ گیری پیدا ہو گئی جو آج تک کسی عربی مجلہ کو حاصل نہیں ہو سکی۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسا علمی اور ادبی حلقہ پیدا کیا جو اس عزم و استقلال کے ساتھ ان کے علمی خاکوں کی تکمیل اور ان کے علمی و ادبی نظریات و تصورات کی اشاعت کر رہا ہے۔ سب سے بڑا محقق اور مفکر اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو ایسے جانشین چھوڑ جائے جن کے ہاتھوں اس کا کام جاری رہے۔ دنیا میں انسان کا کوئی عمل مکمل نہیں کہا جا سکتا اس لیے اس فکر کے ربط و تسلسل میں زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔ اس کے بعد ہم شام کے ایک دوسرے ادیب اور مفکر کے سلسلہ میں گفتگو کریں گے جو عبدہ فکر کی شام کے علاقہ میں اہم کڑی ہیں اور جن کی زندگی کا ہر لمحہ عربوں کی فلاح و بہبود اور عربی زبان و ادب کی خدمت میں گذرا۔ وہ ہیں شکیب ارسلان۔

شکیب ارسلان: شکیب ارسلان ۱۸۶۹ء میں لبنان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام امیر حمود ارسلان تھا۔ ارسلان شکیب کا خاندانی نام تھا۔ یہ خاندان بیروت سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے قصبہ شویفات میں آباد تھا۔ اس قصبہ میں زیادہ تر آل ارسلان ہی آباد تھے۔ اس خاندان کا اعزاز و احترام تاریخ کے ہر دور میں ہوتا رہا بقول شکیب ارسلان: "یہ خاندان تاریخ کے ہر دور میں مؤثر اور فعال رہا ہے۔ ادب و ثقافت سے لے کر دفاع و جہاد تک میں خلفاء و سلاطین کا معاون و مشیر کار رہا ہے۔ دور جدید میں بھی ترکی سلاطین و خلفاء کو اس خاندان کے لوگوں پر بڑا اعتماد تھا اور ان سے سیاسی مسائل میں مشورہ لیتے تھے۔ یہ خاندانی تعلق ہی کا نتیجہ تھا کہ شکیب ارسلان نے آل عثمان کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی بلکہ زوال خلافت تک ہر مرحلہ میں اس کی تائید کرتے تھے۔ جہاں تک دولت عثمانیہ کے حکام کا تعلق تھا ان کی بدعنوانیوں اور عوام پر زیادتیوں پر وہ کھل کر تنقید کرتے تھے۔ دولت عثمانیہ سے ان کی وفاداری محض خاندانی تعلقات کی بنا پر

نہ تھی بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے ان کی یہ رائے تھی کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلمانوں کی جو سیاسی صورت حال تھی اس میں کسی مضبوط و مستحکم اسلامی حکومت کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ دولت عثمانیہ کے وجود کو غنیمت سمجھتے تھے اس کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اس کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے وہ تحریکیں جو اس کی مخالفت کرتی تھیں یا کمزور بنا رہی تھیں ان کی وہ شدید مخالفت کرتے تھے۔ شکیب ارسلان کا خاندان جس کے آگے نقطۂ امیر لگا ہوا تھا اس کے معنی نواب یا تعلقہ دار کے ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم انہی کے قصبہ شویفات میں ہوئی اس کے بعد بیروت کے مشہور اسکول مدرسۃ الحکمۃ میں داخل ہوگئے۔ اس اسکول کو مارون فرقہ کے پادری یوسف ولیس بسطران نے قائم کیا تھا۔ مدرسۃ الحکمۃ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہاں جدید علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی اس دور کے عربی زبان وادب کے اچھے اساتذہ اس مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سرکاری زبان ترکی اور ایک غیر ملکی زبان فرانسیسی کے بھی لائق اساتذہ اس میں موجود تھے۔ شکیب ارسلان نے مدرسۃ الحکمۃ میں عربی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ جہاں تک عربی زبان وادب کا تعلق ہے انہیں اسکول میں تعلیم کے دوران اس سے خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا اور عربی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں شیخ محمد عبدہ بیروت تشریف لے گئے تو مدرسۃ الحکمۃ کے ذمہ داروں نے انہیں اپنے مدرسہ میں مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ اپنے وطن سے بغاوت کے الزام میں جلاوطن تھے۔ ان کے استقبال میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ مدرسہ کے ہونہار لڑکوں نے اس جلسہ میں حصہ لیا۔ شکیب ارسلان نے بھی اپنی ایک نظم پیش کی جس کو شیخ محمد عبدہ نے بہت پسند کیا اور شکیب ارسلان سے کہا کہ تم مستقبل میں اچھے شاعر بنو گے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں تمہارے نام سے واقف ہوں۔ شکیب کی عبدہ کے اس جملہ سے بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس کم عمری میں وہ قدیم وجدید دور کے ادیبوں اور شاعروں سے واقف ہو چکے تھے۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں کہ:

۱۸۸۱ء میں مدرسۃ الحکمۃ میں طالب علم تھا۔ اسی زمانہ میں انھیں العروۃ الوثقیٰ سے واقفیت ہوگئی تھی۔ یہ رسالہ جمال الدین افغانی اور شیخ عبدہ کی سرپرستی میں نکل رہا تھا۔ اس کی دھوم سارے عالم اسلام میں مچی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم لوگوں کو صرف ادیبوں اور شاعروں کے حالات جاننے کا شوق تھا، ہماری دنیا ادب و شعر تک محدود تھی اس کو ہم زندگی کا سب سے اہم جزو سمجھتے تھے۔ اور ہمارا خیال تھا کہ ادب و شاعری کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بیکار ہے۔"

عربی ادب و شاعری سے لگاؤ انھیں مدرسۃ الحکمۃ کے اساتذہ کی بدولت پیدا ہوا تھا اور دوسری طرف انھوں نے اس دور کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں ان کا ربط و تعلق شیخ محمد عبدہ سے بڑھا جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں :۔

"یکتائے روزگار، حجۃ الاسلام شیخ محمد عبدہ سے تعارف اور ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب موصوف بیروت ۱۸۸۶ء میں تشریف لائے تھے۔ وہ اپنے وطن سے جلاوطن تھے، میں ان کی آمد کے بعد فوراً ہی ان سے وابستہ ہوگیا۔ ان سے پڑھتا، ان کی نجی مجلسوں میں شریک ہوتا، ان سے جہاں تک استفادہ ممکن تھا میں نے کیا، ان کے علم و حکمت کے سمندر سے اپنے ظرف کے مطابق فیضیاب ہوا۔ مجھے جن حقائق کی تلاش تھی ان کی صحبت میں ملی۔ ان کی ہر جبہ [illegible]

راہوں سے وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہی مناسب اور صحیح ہیں اور انھیں پر چل کر مسلمانوں کو اٹھایا اور ابھارا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ مایوسی کا شکار تھے اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پر یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان جس گردش میں ہیں انھیں اس سے نکالا نہیں جاسکتا اور جس پستی میں ہیں اس سے انھیں ابھارا نہیں جاسکتا۔ شیخ محمد عبدہ جب بیروت سے اپنے وطن مصر واپس چلے گئے تو میرا تعلق ان سے برقرار رہا اور ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ موصوف مجھ پر بڑی عنایت فرماتے تھے یہاں تک کہ میں ان سے بہت قریب ہوگیا اور وہ مجھ سے

بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ جن افکار و تصورات کو وہ لوگوں میں عام نہیں کرنا چاہتے تھے مجھ سے ان کے بارے میں ذکر فرما دیا کرتے تھے۔"

شکیب ارسلان کی اس تحریر سے ان کے مزاج، ان کی ذہنی صلاحیت، ان کے حق کی جستجو اور عبدہ سے تعلقات اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ عبدہ کے فکری رجحانات اور اپنے خود ذاتی ادبی ذوق و صلاحیت کی بنا پر وہ علم و ادب کے میدان میں آگے بڑھے اور اپنی ذاتی محنت و کاوش سے جو علم و ادب کی خدمت انجام دی اس کی بنا پر وہ امیر البیان شکیب ارسلان کے نام سے دنیائے عرب میں مشہور ہوئے۔

شیخ محمد عبدہ سے تعلقات کی بنا پر شکیب ارسلان کے روابط ان کے دوسرے شاگردوں سے بھی قائم ہوئے اور خاص طور سے شیخ رشید رضا جنھوں نے لبنان سے ہجرت کر کے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ غلطی سے الشیخ رشید رضا المصری لکھنے لگے۔

شکیب ارسلان گھر کے خوشحال تھے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس لیے وہ کسی عہدے کے پابند نہیں ہوئے بلکہ پوری آزادی کے ساتھ سیاسی اور سماجی و مذہبی مسائل پر لکھتے رہے دولت عثمانیہ سے انھیں محبت تھی اس لیے ۱۹۱۸ء میں سرزمین حجاز میں دولت عثمانیہ کے گورنر کے خلاف انقلاب آیا تو شکیب ارسلان نے اس انقلاب کی کھل کر مخالفت کی۔ اسی طرح جنگ طرابلس میں وہ ترکی فوجوں کے شانہ بشانہ اٹلی کی فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے ۱۹۲۱ء میں جب شام کا علاقہ ترکوں سے آزاد ہوا تو شکیب ارسلان نے اس علیحدگی پر بھی اپنے رنج و الم کا اظہار کیا، لیکن ان کی مخالفت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا اور ترکوں کو شام کا علاقہ خالی کرنا پڑا کچھ دنوں تک اس علاقہ میں عربوں کی حکومت قائم رہی لیکن فرانس جو عرصہ تک عربوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف عربوں کی حمایت کر رہا تھا لیکن جب اس کو موقع ملا تو اس نے سب سے پہلے شام کے علاقہ کو اپنے چنگل میں لے لیا۔ اور عرب قوم پر دردوں کا خواب

شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ایک ملک سے آزاد ہو کر ایک دوسرے ملک کی غلامی کا شکار ہو گئے۔ شکیب ارسلان نے عربوں کے ترکوں کے خلاف رویہ پر کھل کر تنقید کی اور ان کو جس خطرہ سے آگاہ کر رہے تھے عرب قوم پروروں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور ان کا وہی حشر ہوا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

فلم یستبینوا الرشد حتی ضحی الغد

شکیب ارسلان دولت عثمانیہ کے حامی تھے اور عرب قوم پروروں کی ترکوں کے خلاف مسلسل جدوجہد پر تنقیدیں کر رہے تھے، اب اس علاقہ کی سیاست بالکل بدل گئی کیوں کہ فرانس کی یہاں حکومت قائم ہو گئی۔ شکیب ارسلان کے لیے دو ہی شکلیں تھیں، یا تو وہ اپنے ملک شام میں رہتے اور فرانسیسی استعمار سے مصالحت کر لیتے اور گاہے بگاہے لوگوں کو دکھانے کے لیے عرب قومیت پر کچھ مضامین لکھ دیتے۔ لیکن شکیب ارسلان کی صحیح معنوں میں عربی غیرت وحمیت اور اسلامی نخوت نے انھیں منافقانہ روش سے باز رکھا اور وہ اپنے وطن عزیز سے ہجرت کر کے یوروپ چلے گئے۔ یوروپ کی زندگی میں انھیں کام کے مواقع بھی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دشواریاں بھی تھیں۔ دشواریاں یہ تھیں کہ مہاجرانہ زندگی میں انسان کے اندر خواہ کتنا ہی استقرار واستحکام ہو، سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں نصیب ہوتا۔ چنانچہ شکیب ارسلان جیسا ادیب، شاعر، فنکار اگر اس کو جم کر کام کرنے کا موقع ملتا تو عرب دنیا ان کے فکر وقلم کی جولانی سے مالا مال ہو جاتی۔ شکیب ارسلان کی ذہنی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے جو کچھ بھی کام کیا اس میں بڑی گہرائی وگیرائی ہے اور ان کا اندازِ بیان بہت ہی شستہ اور شگفتہ ہے وہ مغربی زبانوں سے واقفیت کے باوجود عربی زبان کے قدیم الفاظ اور اس کے محاورے اور امثال کو اپنی تحریروں میں استعمال کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا خیال ہے کہ عربی زبان والوں کا صحیح رُخ اسی وقت تک باقی رہے گا جب تک اس زبان میں لکھنے والے اس کو جدید فکری سرمایہ کے ساتھ ساتھ قدیم الفاظ ومحاوروں سے بھی طاقت و

توانائی بخشتے رہیں۔ اور ان لوگوں پر وہ کھل کر تنقید کرتے ہیں جو مغربی تعبیر و اصطلاحوں کو عربی با ماہ میں ترجمہ کر دیتے ہیں اور اپنے خیال میں عربی زبان پر احسان کرتے ہیں۔ یہ خیال بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اسی مزاج کے تحت ترکیبیں اور جملے ڈھلتے ہیں اس لیے اگر اس چیز کو نظر انداز کیا گیا تو زبان کے ساتھ ظلم ہوگا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"زبان کے الفاظ میں نہ تو کوئی چیز قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید، البتہ طریقہ، تحریر بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح نئے الفاظ کے استعمال سے زبان کے اندر وسعت پیدا ہوتی ہے اسی طرح قدیم الفاظ کے استعمال سے زبان کا معیار اور وقار باقی رہتا ہے۔ یورپ کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں لوگ قدیم شعراء و ادباء کے جملوں، محاوروں کو بڑے فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مذہبی کتابوں کے الفاظ و محاوروں کے استعمال سے زبان کے ظاہر و باطن میں حسن و جمال پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ترقی پسند شعراء اور ادباء اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قدیم الفاظ و محاوروں سے جہاں تک ہو سکے اپنا دامن بچائیں، یہاں تک کہ قرآن و حدیث کے محاوروں کے استعمال سے بھی شرماتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبی کتابیں آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتی ہیں حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ قرآن و حدیث کی حیثیت محض مذہبی ہی نہیں بلکہ ان کا انداز بیان ہر زمانہ میں منفرد رہا ہے۔ اور رہے گا۔ ان سے جتنا استفادہ کیا جائے اتنی ہی زبان میں معنویت اور خوبصورتی پیدا ہوگی۔"

شکیب ارسلان کا خیال ہے کہ ان کی اس قوم سے نہ ہمدردی ہے نہ اپنی زبان و تہذیب سے محبت۔ وہ محض جدیدیت کے نام پر لوگوں میں مشہور و مقبول ہونا چاہتے ہیں۔ سطحی اور سستی شہرت کی ہوس عام طور سے انسان کے ضمیر اور روح کو مردہ کر دیتی ہے۔ یہ بات کون کہہ رہا ہے۔ وہ ہیں شکیب ارسلان۔ جن کی نظر و گرفت عربی زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کے تمام مراحل پر ہے اور جو عربی زبان کے نوک پلک سے بھی واقف ہیں اور دوسرے مغربی زبان سے حرف واقفیت نہیں بلکہ اسی زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کے درمیان اپنی زندگی کا

اکثر و بیشتر حصہ گذرا۔ اس طرح شکیب ارسلان کے یہ علمی اور لسانی نظریات نے ان عرب نوجوانوں کو بے راہ روی سے روکا کیونکہ مغرب کا ثقافتی دھارا اس علاقہ کے عوام کو بہائے جارہا تھا۔ اس کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ عربی زبان و ادب بھی اس دھارے میں نہ بہہ جائے اور بظاہر عربی کے الفاظ باقی رہیں لیکن اس کی تعبیریں اور ترکیبیں بدل جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شکیب ارسلان کی شخصیت جدید دور میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس زمانہ میں جو مسائل بھی زیر بحث آتے خواہ وہ سیاسی، اصلاحی، سماجی، مذہبی ہوں یا لسانی وہ ان میں بڑی مستعدی اور سنجیدگی سے حصہ لیتے رہے۔ ان کے ہر نظریہ میں اپنی قوم کا مفاد، اپنے وطن کی خدمت، اپنی تہذیب و ثقافت کی ترقی مقصود۔ اس لئے ان کی قوم انھیں ایک ادیب، مفکر اور مخلص رہنما کی حیثیت سے یاد کرتی ہے اور ہر فرقہ و طبقہ کے لوگوں کو ان پر فخر و ناز ہے۔

اسکے بعد ہم مصر کے دو اہم ادیب اور فنکار پر گفتگو کریں گے جنکی زندگی کا ہر لمحہ زبان و بیان کے مسائل حل کرنے میں گذرا۔ اور جنکے علم و فکر سے جہاں عربی زبان مالا مال ہوتی وہیں انھوں نے عربی زبان و ادب کو ایسا نیا اسلوب اور راستہ بھی عطا کیا جو ان خوبیوں کا حامل تھا جن سے زبان و بیان کا کارواں صرف آگے ہی نہیں بڑھتا بلکہ تیز گام ہو جاتا ہے۔ وہ ہیں ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور علام عباس محمود العقاد ان دونوں ادیبوں کے نام میں عربی زبان و ادب کی ایک تاریخ مضمر ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین:- ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے صوبہ صعید کے ایک گاؤں میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد معمولی ملازم تھے اور انکے ساتھ کثیر الاولاد تھے۔ طٰہٰ حسین انکی ساتویں اولاد تھے۔ اور قدرت نے انھیں بچپن ہی میں بصارت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اسکی تلافی اس نے ذہانت اور قوت یادداشت سے کر دی تھی۔ انھیں دونوں چیزوں کے سہارے وہ زندگی میں آگے بڑھے۔ بظاہر ان کے جو حالات تھے گاؤں کے لوگ ان سے زیادہ سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ وہ گاؤں کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کرینگے

اور اس کے بعد کلام پاک حفظ کریں گے۔ کلام پاک کے حفظ کرنے کے بعد ممکن ہے اسی گاؤں کے مکتب میں گاؤں کے بچوں کو کلام پاک حفظ کرائیں گے لیکن انسان کی نگاہیں کچھ اور دیکھتی ہیں اور صحیفۂ غیب میں کچھ اور لکھا رہتا ہے۔ گاؤں کے اس نابینا فرزند نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں مکمل کی اور اس کے بعد وہ قاہرہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ آیا۔ اس وقت جامعہ ازہر کا دروازہ مصر کے تمام فرزندوں کے لیے کھلا ہوا تھا خواہ ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیت کچھ بھی ہو طٰہٰ حسین ازہر میں داخل ہوئے اور اس وقت اتفاق سے اس میں شیخ سید حسین المرصفی عربی زبان وادب کے استاد تھے۔ وہ صرف ازہر ہی میں نہیں بلکہ مصر کے مانے ہوئے عربی زبان کے ماہر ادیب اور محقق تھے۔ طٰہٰ حسین کو ان سے مبرد کی الکامل رقالی کی الامالی، ابو تمام کی حماسہ پڑھنے کا موقع ملا، اور اسی اثناء انھیں شیخ عبدہ کے شاگرد قاسم امین اور لطفی السید سے استفادہ کے مواقع بھی ملے۔ طٰہٰ حسین نے الازہر میں اپنی تعلیم مکمل کی جس میں وہ ایک ہونہار سمجھ دار طالب علم تھے۔ ازہر کی تعلیم سے ان کی پیاس نہیں بجھی۔ اتفاق سے ۱۹۰۸ء میں جامعہ فواد جو آج قاہرہ یونیورسٹی کے نام سے ہے، قائم ہوئی انھوں نے اپنا داخلہ اس یونیورسٹی میں لے لیا۔ یہ یونیورسٹی بالکل ماڈرن یونیورسٹی تھی جو جدید علوم وادب کے لیے قائم ہوئی تھی، طٰہٰ حسین نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اس میں عربی ادب کے طالب علم بن گئے۔ یونیورسٹی میں جہاں عربی زبان وادب کے پڑھانے کے لیے مصری اساتذہ تھے وہیں یونیورسٹی، یوروپ کے اساتذہ جنھیں عربی زبان سے لگاؤ ہوتا اور وہ زبان وادب کے مسائل پر تنقیدی نظر رکھتے تھے، ان کو زبان وادب کے مسائل پر لکچر دینے کے لیے وقتاً فوقتاً بلاتی رہتی۔ اس طرح طٰہٰ حسین کو قدیم طرز کے پڑھانے والے اساتذہ کے ساتھ ساتھ جدید طریقۂ تعلیم کے ماہرین سے استفادہ کے مواقع ملنے شروع ہوئے اور انھیں زبان وادب کے مسائل پر سوچنے اور غور کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اسی ذوق نے شیخ طٰہٰ حسین کو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین بنا دیا۔ قاہرہ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد طٰہٰ حسین نے اپنا رجسٹریشن Ph.D کے لیے کر لیا اور اپنے مقالہ کے لئے

جو موضوع انھوں نے طے کیا اس سے بھی ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقالہ عباسی دور کے مشہور ادیب و شاعر ابوالعلاء المعری کی سوانح حیات اور ان کے فکر و فن پر تھا جس پر انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر (Doctor of Literature) (الدکتوراۃ) کی ڈگری ملی اور یہ مقالہ بعد میں "ذکری ابی العلاء" کے نام سے چھپا۔ جو اپنی نوعیت کا عربی زبان میں پہلا علمی اور ادبی مقالہ تھا۔ اس کے بعد انھیں حکومت نے مزید تعلیم کے لیے فرانس بھیجا جہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی اور وہاں سے بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں انھوں نے اپنے مقالہ کے لیے جو موضوع انتخاب کیا تھا اس میں بھی طٰہٰ حسین کی علمی ہوس کا اندازہ ہوتا ہے اور اس مقالہ کا عنوان "فلسفۃ ابن خلدون الاجتماعیہ" تھا۔ پہلا مقالہ خالص ادبی تھا اور دوسرا مقالہ ابن خلدون کی اجتماعیات پر افکار و نظریات سے متعلق تھا۔ اس طرح طٰہٰ حسین نے ادب اور علم اجتماع کے درمیان ایک ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ فرانس سے واپسی کے بعد وہ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ اور طلباء کے سامنے انھوں نے کتاب خوانی کے بجائے عربی زبان و ادب کے مسائل پر لکچر دینے شروع کیے۔ اور سب سے پہلے انھوں نے عربی زبان و ادب کے سب سے مشکل محور جاہلی دور کی شاعری اور اس کے ادب پر اپنے لکچروں کا سلسلہ شروع کیا جو مصر کی تاریخ میں بالکل نئے تھے۔ ان کے نظریات کیا تھے اس سلسلہ میں ہم یہاں بحث نہیں کریں گے بلکہ صرف یہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ انھوں نے نوجوانوں کے ذہن میں نئے نئے مسائل پیدا کیے تاکہ ان کے ذہن و فکر کی کھڑکیاں کھلیں اور مسائل کو ناقدانہ حیثیت سے دیکھیں نہ کہ مقلدانہ حیثیت سے۔ ان کے لکچر "فی الشعر الجاہلی" کے نام سے چھپا جس سے وہاں کے سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی حلقہ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس کتاب سے یقیناً ہیجان پیدا ہوا لیکن اس کی بدولت لوگوں میں جوش و خروش بھی پیدا ہوا اور لوگوں نے اس کے خلاف لکھنا شروع کیا اور لکھنے والے ناقص فکر کے لوگ تھے۔ کچھ لوگوں نے طٰہٰ حسین کی موافقت کی اور زیادہ تر

لوگوں نے مخالفت کی۔ موافقت اور مخالفت میں جو مقالات لکھے گئے وہ جہاں علمی اعتبار سے بہت مفید تھے وہیں وہ فن تنقید کے لیے بھی بنیاد بنے۔

اور اس طرح طٰہٰ حسین کی بدولت عربی زبان و ادب کو نئے فکر کے ساتھ نئے تنقیدی نظریات بھی میسّر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء سے لے کر زندگی کے آخری لمحہ تک وہ قاہرہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ ان کا تصنیفی عمل بھی رواں دواں رہا۔ طٰہٰ حسین یقیناً نابینا تھے لیکن قدرت نے انھیں نئی چیزوں سے واقف ہونے کے لیے ذرائع و وسائل بھی مہیا کر دیے تھے۔ چنانچہ عربی اور فرانسیسی جاننے والے کو انھوں نے اپنا سکریٹری متعین کیا اور یہ دونوں حضرات عربی اور فرانسیسی زبان کی اہم کتابوں کو ان کے سامنے پڑھتے اور طٰہٰ حسین ان کو سنتے۔ اس طرح ان کا علم بالکل تازہ رہتا اور قدیم علوم کے ساتھ ساتھ وہ جدید مسائل سے بھی باخبر رہتے۔

اپنی زندگی کے طویل سفر میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور جس موضوع پر لکھا اس میں جدّت اور ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں ان کی ہر جگہ شخصیت جلوہ گر ہے۔ طٰہٰ حسین کا جدید عربی نثر پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے نئے نئے موضوعات کا انکشاف کیا اور عرض بیان کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس میں حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ مواد بھی ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنے موضوع کی پلاننگ کرتے ہیں اور اس کے بعد اس اعتبار سے مواد کی ترتیب دیتے ہیں۔ پلاننگ اور مواد کی ترتیب وہ اس طریقہ سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ہر فکر الفاظ کے نغموں میں ڈھل جاتی ہے۔ اس میں طٰہٰ حسین کی زبان پر قدرت اور اس کی نوک پلک پر مہارت مترشح ہوتی ہے۔ کبھی وہ ایک بات کو مختلف جملوں میں پیش کرتے ہیں اس میں ان کا مقصد طوالت نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر جملہ کے جو دوسرا جملہ اسی فکر کے یہ استعمال کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ فکر دونوں جملوں میں مربوط ہو جاتی ہے۔ اور جملے اتنے حسین اور خوبصورت ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے۔ طٰہٰ حسین کی

عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی زبان وادب کے طویل مرحلوں کو جو لاتسکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی پہلی کوشش الادب الجاھلی اور دوسری کوشش ھامش السیرۃ اور تیسری کوشش حدیث الاربعاء اور چوتھی کوشش ذکری ابی العلاء مع المتنبی اور اس کے بعد فلسفۃ ابن خلدون، چھ سعدیوں کو تقریباً انھوں نے ان مختلف کتابوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے بعد جدید دور کے ادیبوں اور فنکاروں پر ان کے فکر وفن پر ادیبانہ اور عالمانہ انداز میں گفتگو کی۔ اس طرح جاہلی دور سے دور جدید تک کے علمی، ادبی ثقافتی اور تہذیبی و تنقیدی مسائل کو انھوں نے جس انداز اور جس طرز سے پیش کیا یہ انھیں کے قلم کا کرشمہ ہے۔ طہٰ حسین نے بہت کچھ لکھا لیکن میری رائے میں ان کی دو کتابیں زبان وبیان کے لئے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں پہلی علی ھامش السیرۃ اور دوسری الایام جو تین جلدوں میں اپنی زندگی کے حالات کے سلسلہ میں انھوں نے مرتب کی ہے اس طرح طہٰ حسین کے قلم سے عربی نثر نگاری کو جو معنویت اور حسن بیان میسر ہوا وہ جدید دور کی تاریخ میں نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہم عباس محمود العقاد کے ادبی کارنامے پر بحث کریں گے۔

عباس محمود العقاد: ۱۸۸۹ء میں مصر کے مشہور تاریخی شہر اسوان میں پیدا ہوئے اور اس شہر میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی اور اس کے بعد وہ چودہ سال کی عمر میں قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے جہاں وہ اپنی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ باقاعدہ مدارس اور جامعات میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکیں بلکہ اپنی متوسط تعلیم کے بعد انھیں اسکول چھوڑنا پڑا اور کسب معاش کے لیے ملازمت کرنی پڑی۔

قدرت کا یہاں ایک دوسرا معجزہ نمودار ہونا تھا کہ معمولی خاندان کا ایک فرزند جو اپنے محدود ذرائع و وسائل کی وجہ سے قانون اور اعلیٰ تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوا لیکن اس کے دل میں علم کے حصول کا ایک عجیب وغریب جذبہ تھا بلکہ عجیب وغریب امنگ تھی اور یہ ایسی امنگ تھی جو عہد شباب سے لے کر زندگی کے آخری مرحلہ تک قائم رہی۔ اور ان پر زندگی کے مختلف نشیب و فراز آتے رہے۔ فقر و فاقہ جیل اور دوسری پریشانیاں لیکن ان کا حوصلہ کبھی مدھم نہیں ہوا

بلکہ زمانہ۔ مصائب اور مشکلات میں ان کے ذہن وفکر کے جوہر اور کھلتے رہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کا علم ایسے سوتے سے مل گیا ہے جو کبھی بھی نہیں رکتا۔ عقاد دنیائے عرب میں بحیثیت شاعر، مفکر، صحافی اور ادیب منظر عام پر آئے اور ہر میدان میں انھوں نے جو جوہر دکھائے وہ دور جدید کا ایک اہم کرشمہ ہے۔ قدرت نے جہاں ان کو جسمانی طور پر مضبوط اور صحت مند بنایا تھا وہیں معنوی اعتبار سے ان کے اندر غیرت، حمیت، وفاداری اور رواداری عطا کی تھی۔ انھوں نے جس زمانہ میں قلم اپنے ہاتھ میں لیا۔ یہ بھی ایک عجوبہ تھا کہ متوسط درجہ کا تعلیم یافتہ شخص زبان وبیان کا کس طرح امام بن جائے گا۔ اور شاعری سے لے کر ادب وتنقید کے مسائل پر کس طرح اس کے جوہر کھلیں گے۔ لیکن انسان کے عزم وحوصلہ کے سامنے مشکل سے مشکل چیز آسان ہو جاتی ہے۔ اور بڑا سے بڑا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ عقاد نے ہر موضوع پر پڑھنا شروع کیا اور ان کے مطالعہ میں تنوع کے ساتھ ساتھ گہرائی اور ہر مضمون پر پوری گرفت تھی۔ چنانچہ وہ جس مضمون پر قلم اٹھاتے مواد کی بدولت وہ مضمون اپنی نوعیت کا نیا اور نرالا بن جاتا اور ہزاروں صفحات کو وہ تھوڑے صفحات میں جس طرح سموتے، یہ انھیں کے قلم کی خوبی تھی۔ اپنی زندگی کے طویل سفر میں انھوں نے طٰہٰ حسین کی طرح بہت کچھ لکھا اور جس موضوع پر بھی لکھا دوسروں کے لیے اس موضوع پر قلم اٹھانا مشکل کر دیا۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے عقاد کا طرز تحریر طٰہٰ حسین سے مختلف ہے۔ عقاد پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جس انداز میں وہ سمیٹتے ہیں ان کی فکر میں تعقید نہیں ہونے پاتی کیونکہ وہ لکھنے سے پہلے مضمون پر مختلف زاویے اور گوشے سے سوچتے ہیں۔ اس لیے مضمون کی ابتدا اور انتہا میں ایک مستحکم ربط قائم رہتا ہے۔ اس موقعہ پر ہم ان کے ہر پہلو پر گفتگو نہیں کریں گے کیونکہ ان کا ہر پہلو ایک مستقل مقالہ کا متقاضی ہوتا ہے لیکن یہاں ہم ان کے ان موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو اپنی نوعیت کے عربی زبان میں بالکل نئے ہیں۔ وہ ہیں ان کی کتابیں جو مختلف ادوار کی شخصیات پر مشتمل ہیں۔

عقاد کے یہاں مختلف شخصیات کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سے کچھ عبقریات کے نام سے

مشہور ہیں اور کچھ اشخاص کے نام پر۔ اشخاص کے نام پر جو ہیں ان میں سعد زغلول، حیاۃ ابن الرومی من شعرہ، برنارڈ شو، مہاتما غاندی، عقاد جب شخصیات پر لکھتے ہیں تو سب سے زیادہ وہ جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ ہر شخصیت کا مزاج اور اس کی ذہنی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر وہ اپنی کتاب کی ساری عمارت تعمیر کرتے ہیں اور جب ان کا قلم ان شخصیات کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک پہنچتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عقاد کو ان تمام شخصیات کے ساتھ رہنے کا اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس میں عقاد کی غیر معمولی ذہانت، ان کے تجزیاتی انداز اور ہر چیز کے لیے مناسب اور معنی خیز الفاظ کا استعمال ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں حسین سے حسین تر الفاظ کے استعمال کے سلسلہ میں مشہور ہیں۔ اور اس میں وہ اپنے تمام معاصرین کو پیچھے کر دیتے ہیں۔ ان کا ذوق شاعرانہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ فکر اور فلسفہ کے دامن کو بھی نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ شاعرانہ اور فلسفیانہ مزاج کی بدولت جو فن وجود میں آتا ہے اس کی حیثیت عالمی ہوتی ہے اور وہ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں جہاں انسانی فکر ہوتی ہے وہیں اس کے جذبات اور اس کے دل کی دھڑکنیں بھی پہلو بہ پہلو ہوتی ہیں۔ اور یہ دونوں عناصر شعر و نثر دونوں کی جان ہیں۔ اور عباس محمود العقاد نے انھیں دونوں عناصر کی بدولت اپنے فن کو آگے بڑھایا اور زندگی بھر اس کے داعی اور مبلغ رہے۔ چنانچہ وہ جہاں ادبی دنیا میں محدّر کی حیثیت سے روشناس ہیں وہیں وہ نئے اسٹائل اور اسلوب کے موجد بھی مانے جاتے ہیں اور عربی نثر کا کارواں ان کی تحریروں کی بدولت ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچا۔

(باقی آئندہ)